بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

بطنِ مستقبل میں پنہاں حالات و واقعات کے بارے میں انسان کی پیش گوئی و پیش بینی اگر درست ثابت ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر حال میں اس کے قلبی سکون اور ذہنی اطمینان کا باعث ہی ہو۔ اگر اندازے کے مطابق مستقبل روشن ہو اور اس کے پردے کے پیچھے سے رونما ہونے والے واقعات اندازے کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کر دیں تو انسان اپنی پیش بینی پر فرحت و شادمانی محسوس کرتا ہے لیکن اگر حالات کا رُخ کسی المناک انجام کی نشاندہی کر رہا ہو اور اس بنا پر انسان کو مستقبل کے بارے میں کئی قسم کے خدشات لاحق ہوں اور نتائج ان خدشات کو صحیح ثابت کر دیں تو انسان اپنی پیش گوئی کی صحت پر مسرت محسوس کرنے کے بجائے شدید کرب و اضطراب محسوس کرتا ہے۔ اس انسان کی کیفیت کسی مریض کے اس قریبی عزیز کی سی ہوتی ہے جسے مریض کے مہلک مرض اور اس کے حسرتناک انجام کا بخوبی اندازہ ہو مگر وہ خدا سے گڑگڑا کر یہ دعائیں مانگے کہ قادرِ مطلق اس کے اندیشوں اور خدشات کو غلط ثابت کر دے اور مریض کو صحت عطا فرمائے کیونکہ اس حالت میں اس عزیز کو اپنے خدشات صحیح ثابت ہونے پر خوشی نہیں بلکہ شدید رنج ہوتا ہے اور اگر خدشات غلط ثابت ہوں تو وہ فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے۔

قریب قریب یہی ذہنی کیفیت پاکستان اور ملت اسلامیہ کے ہر بہی خواہ کی ہے۔ بدقسمتی سے یہاں گذشتہ ۲۵ سالوں سے حالات نے ایک ایسا رخ اختیار کر رکھا ہے جسے دیکھتے ہوئے حساس دل کو اس ملک کے مستقبل کے بارے میں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے، اور اس کی تاریکی کے تصور ہی سے اس کی نبضیں ڈوبنے لگتی ہیں، خصوصاً وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ ملک عملاً کسی خوفناک تباہی کی لپیٹ میں آ رہا ہے تو وہ سخت پریشان ہوتا ہے، اور اس پریشانی کے عالم میں خدا کے حضور میں ہاتھ پھیلا کر دعا کرتا ہے۔ یا الٰہا!

اپنی رحمت سے ہمارے اندیشوں کو غلط ثابت کر دے۔ ملک و ملت کے افق پر ہر طرف جو تاریکی چھائی ہوئی ہے اسے روشنی میں بدل دے۔ یہ دعائیہ کلمات ملک و ملت کے ہر خیر خواہ کی زبان سے بے ساختہ نکلتے رہتے ہیں مگر روح فرسا حالات کو دیکھتے ہوئے اس کی گھبراہٹ دور نہیں ہوتی کیونکہ وہ ٹھوس حقائق کو روشن مستقبل کی خوشخبری دینے والوں سے بالکل مختلف پاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈوبتے کے لیے تنکے کا سہارا بھی بہت بڑا سہارا ہوتا ہے، لیکن اگر یہ سہارا بھی دغا دیتا دکھائی دے رہا ہو تو پھر امیدوں کے چراغ روشن نہیں رہ سکتے۔ یہ چراغ بھی اسی وقت جلتے ہیں جب تک کہ ان کے جلنے کا کچھ نہ کچھ سامان موجود ہو۔

پاکستان اگرچہ بڑی نیک تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ معرض وجود میں آیا اور اس سے نہ صرف پاک و ہند کے مسلمان بلکہ پوری دنیائے اسلام بڑی خوش کن توقعات وابستہ کیے ہوئے تھی مگر حالات پر گہری نظر رکھنے والے لوگ گو دل سے یہ دعائیں تو ضرور کرتے تھے کہ خدا کرے کہ یہ توقعات پوری ہو جائیں مگر انہیں حقائق کو دیکھتے ہوئے بہت سے خدشات بھی لاحق تھے۔ انہیں مسلم لیگ کی مقبولیت، اس کی بے پناہ قوت کے بارے میں تو کوئی شک نہ تھا۔ مگر اس بارے میں انہیں اندیشہ ضرور لاحق تھا کہ کیا یہ جماعت پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانے میں بھی کامیاب ہوگی۔ وہ جب اس جماعت کے سربراہوں کی اسلام کے ساتھ وابستگی کے دعوؤں کو سنتے تو انہیں بلاشبہ خوشی ہوتی کہ وہ اس ملک کو صحیح سمت پر لے جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی خوشی اضطراب اور پریشانی میں تبدیل ہو جاتی جب وہ یہ دیکھتے کہ اسلام سے محبت کا دم بھرنے والے دنیائے عمل میں جو کچھ کر رہے ہیں اس سے ان کے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی اور اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے انہیں جو کچھ آگے بڑھ کر کرنا چاہیے وہ نہیں کر رہے بلکہ ہر گام پہ دباؤ کے تحت انہیں اس منزل کی طرف آگے بڑھنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے جس کی نشاندہی خود انہوں نے کی تھی اور جس کی پکار سے قوم ان کے گرد جمع ہوئی تھی۔ حالات پر نگاہ رکھنے والوں کے لیے ان سربراہوں کا یہ طرزِ عمل کوئی غیر متوقع نہ تھا۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہے، ان میں چند قابل قدر مستثنیات کو چھوڑ کر باقی اسلام کے ساتھ محبت کے دعوے میں مخلص نہیں۔ چنانچہ وہ دین حق کی عملداری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذمہ داریاں قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے۔ لیکن ملک کے بہی خواہ ان حقائق کے جانتے ہوئے بھی دعا کرتے رہے کہ

جن لوگوں نے پاکستان بنایا ہے انہیں کے ہاتھوں یہاں اسلامی نظام بھی قائم ہو جائے۔

اس طرح پاکستان کے جنم لینے کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے ہی اس ملت کے سوچنے سمجھنے والے دماغ اس بات پر تو خوش تھے کہ مسلمانوں کو الگ خطہ ارضی مل گیا ہے مگر اس کے حفظ و بقا کے بارے میں وہ متعدد اندیشے رکھتے تھے۔ مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والے ملک کے خلاف مغربی قوموں کے شدید ردعمل کا بھی انہیں پوری طرح احساس تھا اور وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ غیر مسلم اس قسم کے ملک کو کسی حال میں بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس ضمن میں انہیں سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ پاکستان کے مختلف صوبوں اور خصوصاً مغربی اور مشرقی پاکستان جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ حائل ہے، کے مابین آخر یک جہتی کس طرح پیدا ہوگی جبکہ اسلام کے سوا ان کے درمیان کوئی دوسری قدر مشترک بھی نہیں۔ اس یک جہتی کے پیدا کرنے کی انہیں ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ اسلام کو پاکستان کے ہر حصے میں ایک ایسی غالب قوت بنا دیا جائے کہ اس کے مقابلے میں ساری عصبیتیں نہ صرف دب جائیں بلکہ ختم ہو جائیں اور دین کے ایک مضبوط رشتے کے علاوہ پاکستانی کسی دوسرے رشتے کے قائل نہ ہوں۔ وہ سوچیں تو اسلامی نقطۂ نظر سے اور عمل کریں تو اسلام کے وسیع تر مفادات کی خاطر۔ اسلام ان کی زندگی کی غایت اولیٰ ہو اور اس کے علاوہ اُن کے فکر و عمل کا کوئی دوسرا محرک نہ ہو۔ پاکستان اسلام کے ساتھ جس جذباتی وابستگی کی فضا میں قائم ہوا اُس سے اگر کما حقہ فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کو نصب العین کے معاملے میں بالکل یکسو رہنے دیا جاتا اور اسے اس نصب العین کی طرف آگے بڑھانے کے لیے پورے خلوص سے کوشش کی جاتی اور ملک کے برسر اقتدار افراد بھانت بھانت کی بولیاں بول کر قوم کے اندر پریشان فکری اور پریشان نظری کی آبیاری نہ کرتے تو اس ملک کے ہر حصے میں اسلام کی بنیاد پر ایک ایسی مضبوط قومیت معرض وجود میں آ سکتی تھی جو رنگ، نسل، جغرافیائی حدود اور معاشی مفادات کے بجائے دین حق کے سرمدی پیغام کی علمبردار ہونے کی وجہ سے دنیا کی ایک بہت بڑی قوت ہوتی بلکہ ظالموں، سفاکوں اور زبردست آزاروں کے لیے ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتی مگر ؂

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہوسِ اقتدار اور جنگِ زرگری نے اربابِ اختیار کو اس بنیادی کام سے یکسر غافل رکھا۔ وہ عوام کے جذبات

سے کھیلنے کے لیے اسلام کا نام تو لیتے رہے، اپنے بیانات اور تقریروں میں اس کی خوبیاں بھی بیان کرتے رہے لیکن اس کے عملی نفاذ سے انھوں نے ہمیشہ پہلوتہی کی اور جب کبھی مجبوری کے عالم میں انھیں اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا پڑا تو ہر صاحب بصیرت کو یہ صاف محسوس ہوا کہ وہ اسلام کی طرف اس طرح بادلِ نخواستہ دھکیلے جا رہے ہیں جس طرح کسی جانور کو مذبح کی طرف لے جایا جارہا ہو اور جونہی یہ دباؤ کم ہوا تو فوراً الٹے پاؤں بھاگے گویا کہ انھیں موت سے نجات حاصل ہوئی ہے اس ملک میں جس طرح قرارداد مقاصد، جس کی حیثیت نشان منزل کی سی تھی، پاس ہوئی۔ پھر اس قرارداد اور اس کے عملی تقاضوں سے جس طرح انحراف کیا گیا اور اس ملک کو اسلامی جمہوریہ کہلانے پر جس قسم کے بھونڈے اعتراضات کیے گئے اور دستور کو سیکولر بنانے کے مختلف مراحل پر جو چالیں چلی گئیں وہ تاریخ پاکستان کے نہایت المناک ابواب ہیں اور ان کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ لادینی نظام کو ملک پر مسلط کرنے کی شدید آرزو رکھنے والے وہ لوگ ہیں جن کی زبانیں اسلام کی تعریف و توصیف میں ہر وقت متحرک رہتی ہیں اگر یہ لوگ اپنے اس منافقانہ رویہ کو ترک کر کے لوگوں کے سامنے دل کی بات برملا کہتے اور انھیں صاف صاف بتا دیتے کہ وہ کمال اتاترک کی طرح ملک میں لادینی نظام رائج کرنا چاہتے ہیں تو اس سے شاید اتنا عظیم نقصان نہ پہنچتا جتنا کہ ان کی اس منافقانہ روش سے پہنچا ہے۔ اِس صورت میں ان کے عزائم اس ملک کے عوام و خواص کے سامنے بالکل واضح ہوتے اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کر لیتے کہ انھیں کس شخص کو اقتدار کے تخت پر متمکن کرنا اور کس کے اثرات سے قوم کو بچانا ہے۔ اور اس کے لیے انھیں کیا تدابیر اختیار کرنی ہیں؟

نفاق ہماری قومی زندگی کا سب سے خوفناک روگ بن گیا ہے۔ جو عزائم ہمارے دل میں ہوتے ہیں انھیں ہم اپنے ہم وطنوں سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جن عزائم کے تذکروں سے ہماری زبانیں ہر وقت تر رہتی ہیں ان کے لیے ہمارے دل میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اس نفاق نے ہماری قومی صلاحیتوں کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ایسے خوفناک تضاد کو جنم دیا ہے جس کے ہوتے ہوئے ترقی تو کجا ہم زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ جس طرح کسی فرد کے لیے سانس لینا ضروری ہے بالکل اسی طرح کسی قوم کے لیے اپنے نصب العین کے بارے میں یکسوئی اور اس سے گہری محبت اور اس کی خاطر ہر چیز قربان کرنے کا عزم رکھنا بھی ضروری ہے۔ جو قومیں

فکر و عمل کے تضاد میں مبتلا ہو جاتی ہیں یا جن کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے جو اپنے عزائم کے بارے میں مخلص نہ ہوں یا مکر و فریب سے اپنی قوم کی گردن پر مسلط رہنے کے لیے نت نئے تجربات کرتے رہتے ہوں وہ قومیں دنیا میں کبھی پنپ نہیں سکتیں اور بہت جلد انتشار کا شکار ہو کر اپنے وجود کو خود اپنے ہاتھوں سے نیست و نابود کر دیتی ہیں۔

اسے ہماری قومی زندگی کے روح فرسا المیے کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس نفاق اور تضاد کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ہم نے اپنی روش میں کوئی معمولی تبدیلی بھی پیدا نہیں کی اور بڑی تیزی کے ساتھ اسی ڈگر پر چلتے جا رہے ہیں جس پر چل کر ہم اس افسوسناک انجام کو پہنچے ہیں۔ ہماری زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں جو نفاق کی ہلاکت خیزیوں سے محفوظ ہو۔ حالات کا مطالعہ کرنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے برسرِ اقتدار طبقے غالباً اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ انہیں قوم کو دھوکہ دے کر ہی اس پر فرمانروائی کرنی ہے۔ ماضی میں تو جو ہوا سو ہوا حال میں جو طبقہ ملک کے سیاہ و سپید کا مالک ہے وہ بھی ہر مرحلے پر قوم کے ساتھ فریب کاری کو ہی اپنا سب سے بڑا کمال سمجھتا ہے اور اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اس کی مدد سے وہ قیامت تک تختِ اقتدار پر فائز رہ سکے گا۔ پر فریب نعروں اور خوش کن توقعات کے طلسم میں گرفتار کر کے اس طبقے نے عوام سے ووٹ حاصل کیے اور انہیں ایک ایسے تابناک مستقبل کی بشارت دی جس کی حیثیت افسانے سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ خصوصاً معاشی خوشحالی کے تو ایسے دل کش نقشے پیش کیے جو کبھی عوام کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتے تھے۔ ان لوگوں نے اقتدار کے حصول کی خاطر عوام کو ہر طرح بہکا پھسلا کر اپنے پیچھے لگا لیا اور اس بات کا قطعاً احساس نہ کیا کہ وہ کسی اور کو نہیں بلکہ اپنی قوم کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں۔ لیکن ہوس اقتدار نے انہیں اخلاقی اقدار سے یکسر غافل کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے قوم سے ایسے عجیب و غریب وعدے کیے جن کے بارے میں انہیں خود اس بات کا یقین تھا کہ وہ ان میں سے ایک فیصد بھی پورا کرنے سے قاصر ہوں گے۔ ملک کے اصحابِ بصیرت ان لوگوں کی فریب کاریوں اور عوام کی سادہ دلی پر سخت مضطرب اور پریشان تھے اور یہ سوچتے تھے کہ جس روشن مستقبل کی خوشخبری دی جا رہی ہے وہ کس طرح نمودار ہوگا۔ وہ ان لوگوں کی تشکیل کردہ تنظیم کی فکری بنیادوں سے لیکر اس کے عملی پروگراموں تک کے بارے میں غور و فکر کرتے مگر انہیں ہر چیز حقیقت سے زیادہ سراب دکھائی دیتی۔ وہ اس تحریک کے قائد کی زبان سے جب

یہ آواز سنتے کہ اسلام ہمارا دین، اشتراکیت ہماری معیشت اور جمہوریت ہماری سیاست ہے تو انہیں اس بات پر بڑا تعجب ہوتا کہ آخر اس مجموعہ اضداد سے قوم فکری اور عملی انتشار سے بچ کر تعمیر و ترقی کے راستے پر کس طرح گامزن ہو سکے گی۔ ملک کے مختلف عناصر کو اپنے پیچھے لگانے کے لیے اور ہر طبقہ خیال میں سے اپنے حامی تلاش کرنے کی غرض سے تو یہ نعرہ اگرچہ اپنے اندر بڑی کشش رکھتا تھا لیکن قوم کے اندر نصب العین کے بارے میں یکسوئی پیدا کرنے کے معاملے میں اس سے زیادہ تباہ کن کوئی دوسرا نعرہ نہ ہو سکتا تھا۔ وہ قوم جو پہلے ہی پریشان نظری کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی اسے اس نوعیت کے متضاد نظامہائے حیات کی طرف بلانا درحقیقت تباہی کی طرف بلانے کے مترادف ہے۔

فکری انتشار کے علاوہ یہ چیز بھی بڑی آسانی کے ساتھ ہر ہوش مند شخص کے ذہن میں آسکتی تھی کہ جب یہ متضاد عناصر پر مشتمل گروہ تخت اقتدار پر براجمان ہو کر پارٹی کے منشور کے مطابق مختلف بلکہ متضاد سمتوں کی طرف میدان عمل میں آگے بڑھنے کی کوشش کریگا تو اس سے اجتماعی زندگی میں لازمی طور پر خوفناک افتراق پیدا ہو گا۔ جب کوئی گروہ اپنی قوم کے افراد کو بیک وقت دو ایسی کشتیوں میں پاؤں رکھنے پر مجبور کر دے جو ایک دوسرے کی مخالف سمت میں تیرنے والی ہوں تو ان افراد کا سمندر کی لہروں کی نذر ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ ملک و قوم کے بہی خواہوں نے ان سارے خطرات کی بروقت نشاندہی کی۔ جو لوگ اس قسم کے متضاد نظریات کے ساتھ ملت کی بگڑی بنانے کا عزم لے کر اٹھے تھے ان پر اُن کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کی اور دلائل سے انہیں سمجھایا کہ اس قسم کے عزائم کسی قوم کو کس قسم کے بھیانک عواقب سے دوچار کرتے ہیں پھر عوام جو ان لوگوں کے بھرّوں میں آکر غور و فکر کی صلاحیتیں کھو بیٹھے تھے انہیں بھی ان عزائم کے خوفناک نتائج سے متنبہ کیا۔ مگر افسوس کہ ان میں سے کسی ایک طبقے نے بھی شدت جذبات کے اندر عقل کی کوئی بات سننا گوارا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ملک تباہی کے ایسے گرداب میں پھنس گیا ہے جسے ہر شخص خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے مگر اس اندوہناک صورت حال کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ارباب اختیار اپنے طرزِ عمل میں کوئی معمولی تبدیلی پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہے ہے۔ دستور میں نہایت واضح طور پر یہ طے کر دیا گیا ہے کہ پاکستان کا مذہب اسلام ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس ملک کے وجود کی غرض و غایت صرف ایک ہے کہ اسے اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدارِ حیات کا گہوارہ بنایا جائے اور

یہاں وہ بھلائیاں فروغ پائیں جنہیں دینِ حق فروغ دینا چاہتا ہے اور ان برائیوں کا قلع قمع کیا جائے جن کے مٹانے کا قرآن و سنت میں حکم دیا گیا ہے لیکن یہاں برسرِ اقتدار گروہ کے نہایت ذمہ دار افراد جنہوں نے دستور کی اس دینی اساس کو حلف اٹھا کر تسلیم کیا ہے اس طے شدہ امر کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب ایک طرف اس دستور کی وفاداری کا عہد بھی کرتے ہیں مگر دوسری طرف عوام کے سامنے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری منزلِ مقصود اس ملک میں سائنٹیفک سوشلزم کا نفاذ ہے۔ دوسرے صاحب ایک مجلس میں اسلام کی دوسرے ادیان پر غیر معمولی فوقیت اور برتری ثابت کرتے ہیں اور قوم کو یہ مژدہ سناتے ہیں کہ اس کی دنیوی فلاح اور اخروی کامرانی کا راز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں مضمر ہے اور حضورؐ کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن دوسرے یا تیسرے روز ہی جب ایک اور محفل میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو وہاں سائنٹیفک سوشلزم کی عظمت کا نقش سامعین کے قلب و دماغ پر بٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور واشگاف الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ ان کی پارٹی کو بہر طور یہاں سوشلزم ہی نافذ کرنا ہے۔ اس کے بعد پھر زبانِ فیض ترجمان سے اسلامی نظام کی برکات کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ حکومت کے یہ اساطین کس ترنگ میں آکر اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں ورنہ کسی صاحبِ ہوش سے اِس قسم کی تضاد بیانی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان لوگوں کو نہ تو اپنے مرتبہ و مقام کا کوئی احساس ہے اور نہ اپنی زبان ہی کا کوئی پاس اگر انہیں سوشلزم ہی عزیز ہے تو پھر ان کے لیے سیدھا اور معقول راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے اِس عقیدے کا بر ملا اظہار کریں تاکہ عوام ان کے موقف سے اچھی طرح آشنا ہو جائیں۔ پھر ایک با اصول انسان ہونے کی حیثیت سے یہ بات بھی انہیں کسی طرح زیب نہیں دیتی کہ وہ ایک ایسے دستور کا حلفِ وفاداری اٹھائیں جس کی اساس ہی سے انہیں اختلاف ہو۔ ان کی اصول پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اس منصب سے یہ کہہ کر الگ ہو جائیں کہ جس دستور کے تحت انہیں اِس منصب کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اس کی بنیاد ہی سے چونکہ وہ متفق نہیں اس لیے وہ اِس منصب پر فائز رہنا نہیں چاہتے۔ اُن کے اس طرزِ عمل سے جہاں ایک اصول پرست انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا وقار بڑھے گا وہاں قوم کے اندر بھی غور و فکر کرنے کی تحریک پیدا ہوگی اور اُسے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی کہ اسلام اور سوشلزم میں سے اسے کس نظام کو اپنانا اور کسے ترک کرنا ہے۔

(باقی بر صفحہ ۷۴)